

Democracy in Chaos

جمہوریت کی فکری و عملی الجھنیں

* ڈاکٹر مستفیض احمد علوی

(Analysis of the Modern Political View)

The real democracy is a goal to be achieved as yet. Its remarkable achievements after the age of enlightenment have blessed only the First World and the third world is in a chaos in this regard. Either they have not been able to flourish democracy or the democracy itself has disguised its manifestations.

The failure of liberal democracy on large scale raises the question that whether democracy is possible. The controversy about its clear-cut definition aggravates to the extent that democracy in the meaning of "the rule of people" is technically impossible.

The remedy has been sought out in the form of Indirect Democracy inspite of the fact that sovereignty can not be represented. Moreover, due to the financial and technical implications of electoral system, it has become unaffordable for the poor nations.

This is how the democracy is linked with capitalism and is suspected to be Western agenda with its imperialistic designs. The modern media has added oil to the fire; it influences public opinion through different techniques and one can not claim that one's opinion is one's own.

In addition, the certain pre-requisites for democracy, make it a singing bird of the spring season only. Under these conditions, the modern western political discourse has questioned the validity and ideological soundness of democratic theory of politics. It is need of the hour that the same view to be reviewed.

جدید سیاسی مفکرین کا کہنا ہے کہ دنیا میں کسی جگہ، اصل جمہوریت موجود نہیں ہے۔ کہیں جمہوریت کی تعریف متعین کرنے میں الجھنیں ہیں تو کہیں اس کے حقیقی تصور اپنانے میں مشکلات۔ کہیں ریاستی نظام نے اس کی روح کو جکڑ رکھا ہے تو کہیں معاشی نظام نے۔ کہیں نظریہ جمہوریت خود اپنے نقائص

کے گھنور میں الجھا ہے تو کہیں انتخابات کی سیاست اور سیاسی جماعتوں کی کھینچا تانی، جمہوریت کی کشتی کو گرداب میں لے آئی ہے۔ لہذا، حقیقی جمہوریت کا خواب، جدید طرز ہائے حاکمیت اپنانے کے باوجود، شرمندہ تعبیر نہیں ہو پارہا۔

آج کل دنیا میں جمہوری طرز حکومت، انتخابی جمہوریت (Electoral Democracy) کی ایک شکل (Model) میں موجود ہے جو خاص طور مغرب کی نشاۃ جدید (Renaissance) یعنی سولہویں صدی عیسوی کے بعد کے دور میں معرض وجود میں آیا۔ یہ طرز حکومت، مغرب نے، قدیم (خصوصاً قرون وسطیٰ کی) مطلق العنان بادشاہت (Monarchy) کے رد عمل میں، عوام الناس کی طاقت کے اظہار کے طور پر اپنایا۔ لہذا (سترہویں صدی و مابعد دور کے) جدید یورپ کا پسندیدہ یہ طرز حکومت، بنیادی طور پر جمہوریت کا ایک 'مغربی ماڈل' (Western Model) ہے جو لیبرل ڈیموکریسی (Liberal Democracy) کے نام سے جانا جاتا ہے۔

لیبرل ڈیموکریسی کی اصطلاح، بیسویں صدی کے آخر میں عام ہوئی۔ اشتراکی فلسفے کے تصور، سماجی جمہوریت (Social Democracy) کے مقابلے میں، ایسی جمہوریت کو لیبرل جمہوریت قرار دیا گیا جسکے تحت کسی ریاستی آئین میں افراد معاشرہ کے افراد حقوق کی ضمانت مہیا کی گئی ہو۔ نظام حکومت، بھلے صدارتی ہو (جیسے امریکہ میں)، پارلیمانی ہو (جیسے بھارت میں) یا آئینی بادشاہت (جیسے کہ برطانیہ میں)، فرد کی آزادی محفوظ ہے اور اسکے انفرادی حقوق کی ضمانت میسر ہے تو ایسی جمہوریت لیبرل ڈیموکریسی کہلائے گی۔

سیاسی و سماجی پہلوؤں سے دیکھا جائے تو یورپی نشاۃ جدیدہ (Renaissance) کے نتیجے میں، مغربی فکر میں دواہم تبدیلیاں واقع ہوئی ہیں۔ پہلی تبدیلی معاشی آزادی کا نظریہ (Liberalism) تھا جس نے معاشی نظام میں انقلاب برپا کیا اور اسکے نتیجے میں یورپی قومیں جاگیرداری کے چنگل سے نکل کر جدید نظام سرمایہ داری (Capitalism) سے ہمکنار ہوئیں۔ دوسری تبدیلی تھی فرد کی خود مختاری (Individual Autonomy) کا تصور، جس نے سیاسی و سماجی زندگی میں بالکل بچاوری اور مغربی معاشرے مطلق العنانیت کے دور سے نکل کر جدید جمہوریت (Democracy) کے نظام سیاست و حکومت سے آشنا ہوئے۔

اس میں شک نہیں کہ جمہوریت، کامیابیوں کے جھنڈے گاڑ رہی ہے مگر ان کامیابیوں کی جلو میں کچھ ادھورے خواب اور کچھ ناکامیوں کا بھی تذکرہ ہے۔ © rasailojaraid.com

آ رہے ہیں۔ مثلاً یہ کہ کیا جمہوریت، افراد معاشرہ کی محرومیاں ختم کرنے میں کامیاب ہو رہی ہے؟ کیا اس طرز حاکمیت کے ذریعے، تمیز بندہ و آقا کا استیصالی نظام ختم ہو گیا؟ کیا فرد اور ریاست یا معاشرے اور حکومت کے درمیان حائل فاصلوں کی خلیج مٹ گئی؟ کیا مذہب اور ریاست کے پیچیدہ تعلقات کار سلجھ گئے ہیں؟۔۔۔ ظاہر ہے کہ ان سوالوں کا جواب ہاں میں دینا مشکل ہے۔ لہذا، جمہوریت کی یہی ناکامیاں، اسے وقت کا سیما ثابت کرنے میں رکاوٹ بن گئی ہیں۔

جمہوریت کا اصل مفہوم کیا ہے؟

جمہوریت کو سمجھنے میں پہلی مشکل یہی پیش آتی ہے۔ جہاں تک اس لفظ کے لغوی معنوں کا تعلق ہے، کوئی واضح اختلاف نظر نہیں آتا، البتہ اس سلسلے میں کچھ مغالطے نظر آتے ہیں جنکی نشاندہی آگے چل کے کی جائیگی۔ مسئلہ سارا جمہوریت کی اصطلاحی تعریف اور فکری پس منظر کو سمجھنے کا ہے، جسکی بحث ہم بعد میں شروع کرتے ہیں۔ پہلے لفظ جمہوریت اور ڈیموکریسی کا تجزیہ کرتے ہیں۔

اردو زبان میں جمہوریت کا لفظ اپنے عربی ماخذ الجمہور کے لغوی مفہوم کی بنیاد پر معروف ہوا ہے۔ عربی لغت کے ماہرین کی آراء سے واضح ہوتا ہے کہ جمہور کا مادہ جمہر ہے، جس کے ایک معنی ہیں کثرت اور دوسرے ہیں ممتاز۔ (۱) لسان العرب میں ہے کہ یہ لفظ جب قوم کے ساتھ آئے تو اس سے مراد ہوتا ہے اس قوم کی ممتاز اکثریت: و الجمہور من الناس: جلمہم و أشرفہم. و هذا قول الجمهور. (۲) گویا انسانوں کے حوالے سے جب یہ لفظ استعمال ہو تو اس سے مراد عوام الناس یا ان کے معززین کی اکثریت ہوتی ہے۔ اسی مفہوم کے پیش نظر کتب اسلامی میں جمہور کا لفظ کثرت سے استعمال ہوتا ہے (۳) جس سے مراد معتبر علماء کی اکثریت ہوتا ہے۔ جیسا کہ مندرجہ بالا عبارات کے الفاظ: و هذا قول الجمهور سے ظاہر ہے۔

لفظ جمہور کے آخر میں یائے نسبی کے اضافے سے اس کے معنی المنسوب الی الجمہور کے ہو جاتے ہیں۔ یعنی اکثریت کی چیز کو جمہوری کہا جائے گا۔ اسی لفظ جمہوری کی مؤنث جمہوریۃ بیان کی گئی ہے۔ اردو زبان میں اس لفظ کے بعینہ یہی معنی مستعمل ہیں۔ (۴)

ماہرین سیاسیات کی تحقیق کے مطابق لفظ Democracy انگریزی زبان میں سولہویں صدی عیسوی میں فرانسیسی سے آیا، جب کہ یہ اپنی اصل کے لحاظ سے یونانی زبان کے الفاظ ڈیماس (یعنی لوگ) اور کراتوس (یعنی طاقت) کے مجموعہ سے ماخوذ ہے۔ لہذا اس لفظ کے معنی لوگوں کی طاقت اور کراتوس (یعنی طاقت) کے مجموعہ سے ماخوذ ہے۔ لہذا اس لفظ کے معنی لوگوں کی طاقت اور کراتوس (یعنی طاقت) کے مجموعہ سے ماخوذ ہے۔ لہذا اس لفظ کے معنی لوگوں کی طاقت اور کراتوس (یعنی طاقت) کے مجموعہ سے ماخوذ ہے۔

استعمال ہوتی ہے اور اس کا مفہوم 'عوام الناس کی طاقت' ہے۔ (۵) گویا اس لفظ کے لغوی مفہوم میں طرز حاکمیت (Form of Government) سے زیادہ قوت حاکمیت پر زور ہے۔

فکری اعتبار سے جمہوریت، یونان سے منسلک کی جاتی ہے۔ مغربی مفکرین کے بقول، معلوم و مرقوم تاریخ انسانی کے مطابق، جمہوریت کی ایک دھندلی سی جھلک قدیم یونانی ریاستوں میں ہی نظر آتی ہے۔ (۶) یہاں ایک مشکل درپیش ہے۔ مغربی مفکرین سیاست، جمہوریت کو بطور نظام حکومت، یونان سے مستعار لینے کی بات کرتے ہیں جبکہ خود یونانی مفکرین جمہوریت کو بطور طرز حکومت کے پسند نہیں کرتے تھے۔ اگر وہ جمہوریت کو ایک طرز حکومت کے طور پر قبول کرتے تو ڈیموکریسی کے بجائے 'ڈیمارکی' Demarchy کی اصطلاح عام ہوتی کیونکہ یونانی زبان میں، عوامی حکومت کے متضاد آمرانہ طرز حکومت کو مونارکی Monarchy کہا جاتا ہے یعنی اس کا لاحقہ 'آرکی' Archy- آتا ہے۔ یہ لاحقہ یونانی لفظ 'آرکاس' Arkhos سے ماخوذ ہے، جسکے معنی سردار اور حاکم کے ہیں۔ ڈیموکریسی Democracy میں 'کریسی' racy- کا لاحقہ، یونانی لفظ 'کرائوس' Kratos سے ماخوذ ہے اور اس لفظ کے بنیادی معنی 'طاقت و قوت' کے ہیں، اور حقیقت یہ ہے کہ ایک بھی قابل ذکر فلسفی 'عوامی طاقت و قوت کی حاکمیت' کے تصور کا حامی نہیں ملتا۔ لطف کی بات یہ ہے کہ علم سیاسیات میں ڈیمارکی Demarchy کی اصطلاح موجود ہے اور ایسی جمہوریت کیلئے استعمال ہوتی ہے جس میں ایکشن یا ووٹ نہیں ہوتا (۷) اور قدیم یونان میں اگر کوئی 'جمہوریت' موجود تھی تو وہ بغیر ایکشن کے تھی ناکہ انتخابی جمہوریت۔ لہذا جدید جمہوری فلسفے کو یونانی فکر سے ماخوذ قرار نہیں دیا جاسکتا۔

یونانی جمہوریت کو موجودہ انتخابی جمہوریت کے مساوی اور ہمزاد کہنے کا مغالطہ، مغرب میں تیرہویں صدی سے شروع ہوا جب یونانی فلسفے کے ترجمے یورپی زبانوں میں ہوئے اور قدیم یونانی ریاستوں کے سیاسی نظام کی وضاحت کے ضمن میں، جمہوریت کا لفظ استعمال ہونا شروع ہوا۔ یہ وہ دور ہے جب خود یورپ میں جمہوری اداروں (مثلاً پارلیمنٹ) کا فروغ ہوا۔ جمہوری اداروں کا یہ ارتقاء یونانی اور رومی طرز ہائے حکومت کے امتزاج سے عبارت تھا جس نے یورپ کی قومی ریاستوں میں موجود، روایتی بادشاہت سے ابھی مکمل نجات حاصل نہیں کی تھی۔ فکر و فلسفہ کے لحاظ سے یہ معاشرے یونان کے زیر اثر تھے مگر سیاسی اور قانونی حوالوں سے یہ ریاستیں رومی ثقافت اور سماج کی ایک دوسری شکل تھیں۔

Moerbeke نے، یونانی زبان میں ارسطو کی کتاب پالیٹکے Politike کا ترجمہ لاطینی زبان میں کیا۔ اس کتاب (۹) میں عوامی حکومت کیلئے ارسطو کے استعمال شدہ لفظ کا متبادل (یا ترجمہ) لاطینی میں 'Demokratia' استعمال کیا گیا اور یہی لفظ بعد میں Democracy کی صورت میں انگریزی زبان میں رائج و مقبول ہو گیا۔ (۱۰)

'ڈیموکریٹیا' (Demakratia) دراصل براہ راست جمہوریت، جسے خالص جمہوریت (Pure Direct Democracy) کہا جاتا ہے، کیلئے استعمال ہوا ہے تاکہ جدید جمہوریت کیلئے جو انتخابات کے ذریعے چنے گئے نمائندوں کی صورت، اسمبلی کی شکل میں رو بہ عمل ہوتی ہے اور جسے بالواسطہ جمہوریت (Indirect Democracy) کہا جاتا ہے۔

ڈیموکریٹیا کی اصطلاح، پانچویں صدی قبل مسیح کے دور میں، یونانی ریاست اتھنز Athens کی مخصوص حکومت کے لیے مستعمل تھی۔ اتھنز کی اس جمہوریت میں بیس سال کی عمر کے تمام مرد شہری فیصلہ سازی میں شریک ہو سکتے تھے، جبکہ عورتیں اور غلام یعنی آبادی کا تین چوتھائی حصہ شہری کہلانے اور حکومت میں شامل ہونے کا حقدار نہیں تھا۔ یہ حکومت براہ راست شرکت 'عوام' کی ایک شکل تھی مگر انتخابی نظام Electoral System کے بغیر۔ لہذا عوامی حاکمیت جو انارکی کے رد عمل یا نتیجے کے طور پر معرض وجود میں آتی ہے وہ 'عوام کی رضامندی سے قائم ہونے والی جدید انتخابی جمہوری حکومت' سے مختلف چیز ہے جس کے لیے 'ڈیموکریسی' کا لفظ استعمال کرنا درست نہیں ہے۔

ڈیموکریٹیا کا متبادل، اپنے صحیح مفہوم کے لحاظ سے ڈیمارکی Demarchy بنتا ہے تاکہ ڈیموکریسی۔ مگر یہ ایک مغالطہ آمیز حقیقت ہے کہ مغرب کے تقریباً تمام قابل ذکر سیاسی مفکرین نے ڈیموکریٹیا کا ترجمہ ڈیموکریسی Democracy ہی کیا ہے، جس سے ایک طرف یہ مغالطہ پیدا ہوا کہ جدید جمہوری نظام قدیم یونانی جمہوریت کی ترقی یافتہ شکل ہے اور دوسری غلط فہمی یہ پیدا کی گئی کہ افلاطون اور ارسطو جب عوامی حکومت کی بات کرتے ہیں تو اس سے مراد مغرب کی جدید جمہوریت ہوتی ہے، جبکہ یہ بات کسی سے ڈھکی چھپی نہیں ہے کہ یونانی مفکرین (خصوصاً) کبھی عوامی انتخابی جمہوریت یعنی ڈیموکریسی کے حق میں نہیں تھے بلکہ انہوں نے اس تصور کی مخالفت کی۔ ستم یہ ہے کہ یہ بات خود مغربی ماہرین سیاسیات بار بار بیان کرتے ہیں۔ مثال کے طور پر، جدید سیاسی مفکر جارج سیباٹین George Sabine نے بیان کیا ہے کہ ارسطو کے سیاسی فلسفے

۱۔ بادشاہت (Monarchy) ۲۔ اشرافیہ (Aristocracy) ۳۔ عوامیت (Polity) یعنی Politeia جسے وہ سب سے اعلیٰ اور مثالی قرار دیتا ہے۔۔ اسکے بیان کے مطابق یہ تینوں جب بگڑتی ہیں تو صورت حال یہ بنتی ہے کہ بادشاہت، جبریت (Tyranny) میں تبدیل ہو جاتی ہے۔ اشرافیہ، مطلق العنانیت (Oligaricy) میں جبکہ عوامیت، ہجوم کی حاکمیت (Democracy) میں۔ اس کا مطلب یہ ہوا کہ ارسطو کے خیال میں، عوام کی حکومت میں شراکت، اجتماعی نمائندگی کے اصول کی بنیاد پر ہو تو یہ حکومت کی ایک اچھی صورت Politeia ہوگی اور اگر یہ جمہور کی طاقت کا روپ دھارے تو ایک بری صورت Democracy ہوگی۔ (۱۱)

یاد رہے کہ ارسطو یہاں آئینی اور دستوری حیثیت سے حکومتوں کے اچھے اور برے ہونے کی صورت بیان کر رہا ہے جسکے مطابق کسی معاشرے میں اگر آئین کی عملداری حکومت کے ہاتھوں، صحیح طور پر انجام نہ پا رہی ہو تو عوام آگے بڑھ کے اقتدار اپنے ہاتھوں میں لے لیتے ہیں۔ عوام کا خود حکومت ہاتھ میں لینا بے شک جمہوریت کہلاتا ہے، مگر یہ صورت، ارسطو کے نقطہ نظر سے مثالی صورت نہیں ہے، وہ عوام کی اقتدار پر اجتماعی اجارہ داری کو بگڑی ہوئی حکومت قرار دیتا ہے۔

لطف یہ ہے کہ خود ولیم مورکے، جس کے ترجمے سے ایک غلط مفہوم عام ہو گیا ہے، نے عوامی حکومت کے لیے ڈیما کریٹیا کا لفظ استعمال کیا تو اسکی نظر ایسی جمہوری حکومت پر نہیں تھی جو عوام الناس کی اکثریت کی بنیاد پر قائم ہو بلکہ ایسی حکومت کو غرباء کے مفادات کی رکھوالی کرنے والی ہو۔ دوسرے لفظوں میں ارسطو کی نظر میں حکومت کی آئینی حیثیت زیادہ اہم تھی اور دلیم کی نظر میں اسکی عملی افادیت زیادہ اہم تھی۔ اسی لیے اس نے ڈیما کریٹیا کی درج ذیل تعریف کی تھی:

A form of government which is conducted for the benefit of
the poor rather than in the public interest.(12)

یہاں غور کریں تو جمہوریت کی تعریف میں ایک اور تبدیلی داخل ہوگئی اور وہ یہ کہ جمہوریت غرباء کے لیے قائم ہونے والی حکومت کا نام ہے، ناکہ محض عوام کی اکثریت کی رضامندی کسی نہ کسی طریقے سے حاصل کر کے حکومت بنالینے کا نام۔ یاد رہے کہ جمہوریت کو غرباء کی حکومت سمجھنا بھی صرف ولیم کی تعریف میں بیان ہوا ہے کسی اور قدیم و جدید سیاسی مفکر کے ہاں ہمیں یہ تصور نہیں ملتا۔ گویا یہ تصور جمہوریت کی تعریف میں خلطِ بحث پیدا کرتا ہے۔

اسی طرح کا ایک اور غلط فہمی ڈیموکریسی (Democracy) اور ری پبلک (Republic) کو ایک ہی مفہوم میں استعمال کرنے سے پیدا ہوئی ہے۔ یہ دونوں الفاظ، افلاطون (Plato) کی اصطلاح Politeia کے لاطینی اور انگریزی مترادفات کے طور پر استعمال کئے گئے۔ 'ری پبلک' کا لفظ انگریزی زبان میں لاطینی لفظ res publica (۱۳) سے لیا گیا ہے جس کے معنی ہیں 'عوام کے معاملات'۔ آج کے دور میں ری پبلک سے مراد ایسا طرز حکومت ہے جو مطلق العنان بادشاہت کے مقابلے میں، عوام کی اقتدار میں شراکت کے تصور پر مبنی ہے۔ (۱۴) جدید مغرب میں یہ لفظ معروف سیاسی مفکر میکیاوولی (Machiavelli 1469-1527) نے اپنی مشہور کتاب The Prince میں اسی مفہوم میں استعمال کیا ہے۔ لیکن اس لفظ کو مغربی سیاسی فکر میں عام کرنے میں بنیادی کردار لیونارڈ برونی (Leonard Bruni 1369-1444) کا ہے جس نے اس لفظ کو افلاطون اور ارسطو کی کتابوں کے تراجم کرتے ہوئے، یونانی اصطلاح Politeia کے متبادل کے طور پر استعمال کیا۔ اس نے ان دو الفاظ میں مماثلت کا تصور دراصل، پہلی صدی عیسوی قبل مسیح کے رومی مفکر سروس (Cicero) سے لیا تھا جس نے سب سے پہلے یونانی لفظ (پالی ٹایا) politeia کو لاطینی میں ری پبلک res publica کے مترادف کے طور پر استعمال کیا۔ (۱۵) اس طرح مغربی جمہوریت کے تصور میں ایک اور ابہام کا اضافہ کر دیا۔

ری پبلک Republic دراصل ایسی سیاسی اکائی یا شہری ریاست کو کہتے ہیں جس میں سربراہی ایک فرد کو حاصل ہوتی ہے مگر اسکی حاکمیت بادشاہ کی طرح مطلق العنان نہیں ہوتی بلکہ حکومت، شہریوں کی ایک کونسل کے ذریعے رو بہ عمل ہوتی ہے۔ جبکہ یونانی اصطلاح پالی ٹایا politeia (۱۶) ایسی سیاسی اکائی یا شہری ریاست کے لیے استعمال ہوتی ہے جس میں شہریوں کی اپنی، آئینی طرز پے منظم، حکومت ہو۔ ایسی حکومت جس میں شہری براہ راست فیصلوں میں شریک ہوں اور آئین کی سربراہی ہو۔ ظاہر ہے ایسی صورت میں دونوں اصطلاحات کو مترادف قرار دینا، ایک مغالطہ تھا۔ اس سے بڑی غلطی وہاں ہوئی جب ری پبلک کو ڈیموکریسی کا متبادل سمجھا گیا درآں حالیکہ اپنے لغوی اور اصطلاحی مفہوم میں، یہ دونوں الفاظ مختلف ہیں۔

جمہوریت کی حقیقی روح کیا ہے؟

الفارابی نے اپنی مشہور کتاب آراء اہل المدینة الفاضلة میں افلاطون (Plato) کے سیاسی افکار کی وضاحت کرتے ہوئے شہری ریاست کے لئے عربی کا متبادل لفظ مدینہ استعمال کیا ہے جبکہ جمہوری معاشرے کے لئے مدینة الجماعیہ کے مترادف استعمال کیا ہے۔ (۱۷) اس کے علاوہ مشہور فلسفی اور مفکر ابن خلدون نے جمہوری معاشرہ قرار دیا

ہے جسکے افراد، ارادہ و اختیار کی آزادی سے بہرہ مند ہوں: مدينة الجماعية، هي التي قصد أهلها أن يكونوا أحراراً، يعمل كل واحد منهم ما شاء۔ (۱۷)

سیاق و سباق کو سامنے رکھیں تو، الجماعیہ، یہاں عوام (شہری آبادی) کیلئے استعمال ہوا ہے، اور مدینہ (شہری) ریاست کے لیے۔ گویا، الفارابی نے، افلاطون کی طرف سے استعمال شدہ لفظ Politeia کا موزوں ترین الفاظ میں ترجمہ کیا۔ الجماعیہ کا انگریزی ترجمہ Community اور مدینہ کا انگریزی متبادل City State بنتا ہے۔ لہذا، مدینة الجماعیة سے مراد ہوگی ایسی شہری ریاست جس کا نظم مملکت اجتماعیت کے پاس ہو۔ اس سے لازمی طور پر جدید جمہوریت یا ڈیموکریسی مراد لینا غلط بحث پیدا کرتا ہے۔ اس لیے بھی کہ افلاطون نے عوامی طاقت کے زور پر قائم ہونے والی جمہوریت کی مخالفت کی ہے۔ مگر ستم یہ ہوا ہے کہ مشہور سیاسی مفکر، روزنیتھال (Rosenthal) نے اسلامی سیاسی فلسفے کے تعارف پر مبنی، اپنی معروف کتاب میں، فارابی کے اس لفظ کو Democracy کے ہم معنی کے طور پر لیا ہے۔ اس مغالطے کی وجہ، اس کے ذہن میں پہلے سے موجود یہ تصور تھا کہ جدید مغربی جمہوریت، قدیم یونانی جمہوریت ہی کا پرتو ہے، اس لیے وہ افلاطون کی اصطلاح کے، فارابی کی طرف سے کیے گئے حقیقی ترجمہ مدینة الجماعیة کو بھی ڈیموکریسی کے مترادف قرار دے دیتا ہے، اس طرح وہ جمہوریت کی تعریف میں دو مختلف مفہام داخل کر دیتا ہے، وہ لکھتا ہے:

Democracy (Madina Jamia'iya) is marked by the freedom of its citizens to do as they please. (18)

یاد رہے کہ یونانی زبان میں افلاطون (Plato) کی کتاب Politeia، جو چوتھی صدی قبل مسیح میں لکھی گئی، موجودہ جمہوریت سے متعلق نہیں تھی اور نہ ہی افلاطون اس طرح کی جمہوریت کا کبھی قائل رہا۔ افلاطون نے اس کتاب میں سقراط کے وہ مکالمے سلسلہ وار لکھے ہیں جن میں سیاسی فلسفہ اور انصاف کے بنیادی تصورات پر روشنی ڈالی گئی ہے اور اسی سلسلہ میں مطلوب طرز حکومت کے خدو خال بیان کیے گئے ہیں۔ لہذا، اس کی کتاب کا موضوع یونان کی شہری ریاستوں کا نظم مملکت تھا، نا کہ جدید مغربی جمہوریت!

سیاسی تاریخ کا تجزیہ ظاہر کرتا ہے کہ جمہوریت اپنے ارتقائی مراحل میں جس شکل سے گذرتی رہی اسی حوالے سے اسکی مختلف تعریفیں اور نام بنائے جاتے رہے۔ گویا جمہوریت کے ارتقاء کا سفر خود جمہوریت کے مفہوم میں تبدیلیوں کا باعث بنتا رہا۔ مختلف قوموں کے معاشرتی و معاشی حالات نے ہر معاشرے کے اپنے

معاملات اور فیصلوں پر فی الواقع، قابل ذکر حد تک اثر انداز ہو سکیں۔

مائیکل سٹیورٹ (Michael Stewart) اس فلسفے کی عملی تشریح یوں کرتا ہے کہ: 'جب لوگ دعویٰ کریں کہ ان کا ملک ایک جمہوریت ہے تو ہم اس کا مفہوم یہ سمجھیں گے کہ ان کا مطلب یہ ہے کہ ان کے ملک کے تمام بالغ شہریوں کو اپنی سیاسی طاقت عمل میں لانے کا ممکنہ حد تک برابر موقع ملتا ہے۔' (۲۱)

اسی طرح جدید ماہر سیاسیات، ایچ۔ بی۔ لاسکی (Laski) نے بھی افراد معاشرہ کی آزادی اور اہمیت و عظمت کو روح جمہوریت قرار دیا ہے:

Democracy rests on a belief in the fundamental dignity and importance of the individual, in the essential equality of human beings, and in the need for freedom. (22)

'جمہوریت کا اصل الاصول فرد کی بنیادی اہمیت اور عظمت کے تصور پر استوار ہے، جس کی

جڑیں انسانوں کی آزادی و مساوات میں جاگزیں ہیں۔'

ان تصورات کو سامنے رکھ کر یہ کہا جا سکتا ہے کہ آج جمہوریت جس طرز سیاست کی غلبہ دار ہے اسکے بنیادی عناصر ہیں: عوام کی بالادستی، افراد کے مساوی حقوق، شہری آزادی اور عوامی فلاح و بہبود۔ گویا جمہوریت ایسے طرز حکومت کا نام ہے جو عوام الناس کی منشاء کے ساتھ، ان کی فلاح و بہبود کیلئے اس طرح سے ترتیب دیا جائے کہ تمام شہریوں کی آزادی اور مساوی حقوق کو تحفظ حاصل ہو۔ جمہوریت کی یہ روح اسکی منزل ہے اور خود جمہوریت اس منزل کے حصول کا ذریعہ۔

غیر جانبدار نظر، ان خیالی اور مثالی دعوؤں کا جائزہ لے تو اس نتیجے پہ پہنچنا مشکل نہیں کہ اگر جمہوریت کی منزل یہ ہے تو اسباب کی دنیا میں اس کا حصول بہت مشکل ہے۔ یہ دعویٰ کافی مبالغہ آمیز لگتا ہے اس لیے کہ دنیا کی آبادی کی اکثریت کو اپنی سیاسی طاقت کی خبر نہیں ہے، جن کو شعور ہے ان کے بس میں اس طاقت کا استعمال نہیں۔ عوام کو سیاسی شعور دینا ایک کاردار دہے کہ تعلیم و خواندگی اکثر انسانی آبادی کو نصیب نہیں۔ تعلیم کے بعد جمہوری عمل کو انتخابات کے ذریعے بروئے کار لانے کے لیے جو وسائل درکار ہوتے ہیں اور افراد معاشرہ میں جن سماجی رویوں کی ضرورت ہوتی ہے وہ تیسری دنیا کی تین چوتھائی آبادی کو نصیب نہیں۔

جدید ماہرین سیاسیات کا کہنا ہے کہ وہ قوم جو شعوری طور پر، ذہنی، تعلیمی اور نظری اعتبار سے بالغ ہوگی اور معاشی لحاظ سے مساوات اور خوشحالی سے آراستہ ہوگی، جمہوریت کا گہوارہ بھی صرف وہی بن سکے گی۔

مثال کے طور پر درج ذیل آراء ملاحظہ ہوں:

ڈیوڈ ہیلڈ (David Held) لکھتا ہے:

Direct democracy requires relative equality of all participants, a key condition of which is minimal economic and social differentiation. (23)

جان برن ہائم (John Burnheim) جمہوریت کی آبیاری کے لیے ضروری شرط یہ بیان کرتا ہے کہ معاشرے کو پہلے اپنے سماجی رویوں میں جمہوری ہونا چاہیے:

The society should be reasonably democratic in its social attitudes. (24)

اسی طرح ایچ جے لاسکی (Laski) کہتا ہے کہ جمہوریت ایک ایسے معاشرے میں نہیں پنپ سکتی جو قحط کی زد میں ہو بلکہ یہ نظام ایسے معاشرے میں پروان چڑھے گی جو تعلیم یافتہ، مناسب حد تک خوشحال ہو (جہاں دولت کی تقسیم میں تفاوت انتہا پر نہ ہو)، جہاں طبقاتی، مذہبی اور فرقہ وارانہ منافرت نہ ہو، اور جہاں تاریخی طور پر جمہوری روایت کا وجود ہو۔ (۲۵)

گویا جمہوریت اپنی مثالی صورت میں ایسے معاشرے میں سامنے آئی گی جہاں ذیل کے عناصر پہلے سے ہم آہنگ ہوں گے:

۱۔ انتخاب میں اپنی رائے کا استعمال کرنے والے افراد پڑھے لکھے اور قدرے خوشحال لوگ ہوں، ب۔ دولت و ثروت کے لحاظ سے ان کے درمیان تفاوت کی خلیج بہت زیادہ وسیع نہ ہو، ج۔ مذہبی، طبقاتی اور فرقہ وارانہ مخالفت سے آزاد ہوں، د۔ جمہوریت کی روایت انہیں تاریخ سے وراثت میں ملی ہو، ر۔ جہاں کئی ایک غیر سرکاری جماعتیں اور دوسرے سماجی ادارے ہوں، جو جمہوریت کے اصولوں اور عملی تجربات کے ساتھ اس کے طریقہ کار کو بھی ترقی دے سکیں۔

ذرا غور سے دیکھا جائے تو معلوم ہوگا کہ آج تک جمہوری نظام کے جو اثرات اور ثمرات بتائے گئے ہیں وہ بھی یہی ہیں۔ گویا جو کچھ جمہوریت کے نتیجے کے طور پر پیدا ہونے کی توقع ہے، وہ جمہوریت کو لانے کے لیے پہلے کسی معاشرے میں بطور شرط درکار ہے۔ اگر کسی معاشرے میں جمہوریت پیدا کرنے کے لیے ایک خاص حد تک جمہوریت کا پہلے سے موجود ہونا لازمی ہے تو یہ ایک اور گرداب ہے۔

جمہوریت طرز حکومت ہے یا طرز زندگی؟

جمہوریت کے ارتقائی سفر کی کہانی سے یہ بات عیاں ہوتی ہے کہ اپنے اصطلاحی مفہوم میں، آغاز میں جمہوریت محض ایک طرز حکومت (Form Of Government) کا نام تھا۔ قدیم و جدید سیاسی مفکرین نے طرز ہائے حکومت کی اصطلاح کو اپنا کر جمہوریت کے مفہوم سے اس کا تعلق قائم کیا ہے۔

ہے)۔ دور جدید میں انسانی حقوق اور آزادی و مساوات کے تصورات کی مقبولیت کے ساتھ یہ ایک طرز زندگی بن چکا ہے۔ حقیقت تو یہ ہے کہ بطور حکومت بھی یہ نظام اسی دور جدید میں ہی مقبول ہوا ہے جبکہ اس سے پہلے ناپسند کیا جاتا رہا ہے۔ جان ڈن (John Dunn) اٹھارویں صدی تک، جمہوریت کی یہ صورت حال بتاتا ہے:

Democracy was not yet a faith, not an ideology, not an ethic, it was still a technical term of political science. (26)

اس طرح پال ای کارکون (Paul E. Corcoran) لکھتا ہے کہ 'گذشتہ پچیس سو سال کے مغربی سیاسی فکر کے تناظر میں دیکھا جائے تو ماضی قریب تک کسی نے یہ نہیں سوچا تھا کہ جمہوریت سیاسی زندگی کی تنظیم کا کوئی اچھا طریقہ ہو سکتی ہے۔' (۲۷)

البتہ دور جدید کے مغربی معاشروں کی طرف سے جمہوریت کو بطور طرز زندگی، قبول عام کی سند حاصل ہوئی ہے، کچھ خاص آبادی میں کچھ مخصوص شرائط کے ساتھ۔ انسانوں کی اکثریتی آبادی اس سے آج بھی محروم ہے۔ بیسویں صدی کے آغاز میں جب سوشلسٹ پارٹی نے روس میں انقلاب برپا کیا اور آدھی دنیا کو سرمایہ دارانہ نظام سے متنفر کر دیا تو بہت سی قوموں نے جمہوریت کو ایک ناکام طرز حکومت سمجھ کے مسترد کر دیا۔

دوسری طرف یورپ کی وہ قومیں جو جمہوریت کے مغربی ماڈل یعنی لبرل ڈیموکریسی کے پروان چڑھنے کے لیے ضروری شرائط کی حامل تھیں، ان میں یہ طرز حکومت ایک طرز زندگی کا روپ دھار گیا۔ حتیٰ کہ اب اسے وہ تقدس حاصل ہو گیا ہے کہ اسکی بنیادی کمزوریوں کی طرف بھی عموماً نگاہ نہیں جاتی۔ گویا اب ایک عالمی مذہب کا مقام حاصل کر چکی ہے، جیسا کہ بعض مفکرین نے لکھا ہے:

Democracy is the world's new universal religion. (28)

لیکن جب ہم اسے طرز زندگی (Life Style) کہتے ہیں تو اس سے مراد زندگی کا ایک عمومی رویہ ہوتا ہے، ناکہ کوئی مکمل ضابطہ حیات جیسا کہ مذکورہ بالا عبارت میں لفظ Religion سے مغالطہ ہوتا ہے۔ جمہوریت علامتی طور پر ایک مذہب کہلا سکتی ہے، حقیقی معنوں میں نہیں۔ البتہ آج کی دنیا میں جمہوری نکتہ نظر ایک عمومی اور ہرگز یز نکتہ نظر بن چکا ہے۔

سولہویں صدی کی نشاۃ ثانیہ نے مغرب کو انسانیت پسندی (Humanism) کی جس ڈگر پہ چلایا تھا اسکا شمار انفرادیت پسندی، انسانی عظمت اور انسانی تہذیب کی نشاۃ ثانیہ کی صورت میں ظاہر ہوا۔ لہذا جمہوریت

کے اثرات دور جدید میں خصوصاً یورپ (پوری دنیا کی آبادی کا بیس فیصد) کے فکر و فلسفہ اور تہذیب و تمدن دونوں پہلوؤں پر ہوئے ہیں۔ ان کی ایک سطح انفرادی زندگی اور دوسری سطح اجتماعی زندگی ہے۔ افراد کی زندگی کے ساتھ قومی زندگی بھی تبدیل ہو گئی ہے۔

یہ سماجی تبدیلی، سیاسی نقشہ بھی بدل چکی ہے۔ لبرل ڈیموکریسی کے تصور نے لوگوں کو اقتدار کا اصل سرچشمہ بنا دیا ہے۔ پرانے بادشاہوں کے خدائی اختیار و اقتدار کے سارے خواص اپنی پوری آب و تاب کے ساتھ جمہوریت کی صورت میں عوام الناس اور انکے نمائندوں کے ہاتھوں جلوہ گر ہوتے ہیں۔ افراد اور قومیں اس جمہوریت کے طفیل روایت، مذہب اور مسلمہ اخلاق کے اصولوں کو ایک آن میں اپنی مرضی کے مطابق نہ صرف بدل سکتے ہیں بلکہ اسے عین اپنا بنیادی حق سمجھنے لگے ہیں۔

جمہوریت حقیقت ہے یا سراب؟

جمہوری نظام کی حقیقت کا تجزیہ دو پہلوؤں سے کیا جاسکتا ہے۔ ایک فکری بنیادوں پر دوسرے اداراتی طریق کار کے حوالوں سے۔ جمہوریت کا دوسرا نام عوام کی حاکمیت ہے۔ یہ فلسفہ ایک طرف فکری و نظری اعتبار سے کئی حوالوں سے نامکمل اور محل نظر ہے اور دوسری طرف اس تصور کے عملی صورت میں ڈھلنے تک، اس میں کئی انحراف واقع ہو چکے ہوتے ہیں۔

شاید اسی وجہ سے گراہم ڈکن (Graem Duncan) کہتا ہے:

Democratic Practice throws a dark light on democratic theory. (29)

اس کی وجہ یہ ہے کہ ہر دو الفاظ Rule اور People کے مفاہیم کی تعین میں الجھاؤ اور پیچیدگی درآتی ہے یعنی یہ کہ لفظ (Rule) کے تحت اقتدار اور حاکمیت کی نوعیت اور حدود و آداب کیا ہوں اور لفظ (People) کے تحت ”عوام“ سے مراد کون ہے؟

حکومت میں عملاً چند لوگ ہو سکتے ہیں جبکہ عوام سے مراد اکثریت ہے، جس کا حکومت کرنا عملاً محال ہے۔ پھر یہ کہ حکومت کرنے کے لیے جس دانائی، بصیرت اور قابلیت کی ضرورت ہے وہ اکثریت کی بجائے اقلیت میں پائی جاتی ہے۔ اس حوالے سے بھی عوام الناس کا حکومت کرنا ناممکن العمل ٹھہرتا ہے۔

لوگ یا (People) ایسا لفظ ہے جو بظاہر ایک ”کل“ کی نمائندگی کرتا ہے اور اجتماعیت کا مفہوم رکھتا ہے مگر اس کے اجزاء یعنی افراد، ذہنی و جسمانی استعداد کے لحاظ سے، معاشی و سماجی مقام کے حوالے سے، پسند و ناپسند اور ترجیحات کے اعتبار سے، صرف و صرف ناممکن بلکہ ناممکن مطلق ہوتے ہیں۔ لہذا اصلاحیت،

مواقع اور ترجیحات کے فقدان کی بنیاد پر ان کا کسی ایسے فیصلے پر پہنچنا ناممکن ہو جاتا ہے جو سب کے لیے یکساں طور پر مفید، موزوں اور قابل قبول ہو۔

”لوگوں کی حکومت“ میں اکثریت کے اصول (Majority Principle) کو تسلیم کیے بغیر چارہ نہیں۔ یعنی جس چیز کو زیادہ افراد قبول کریں، قانون بن جائے گی جبکہ ایک ایسا فیصلہ، جس کی حمایت اقلیت کر رہی ہو اور وہ خواہ کتنی ہی معقولیت پر مبنی ہو، رد کر دیا جائے گا۔ اب یہ ایک ثابت شدہ حقیقت ہے کہ انسانوں کی اکثریت اپنے عمومی فیصلوں میں، معقولیت و منطقیت کی بجائے خواہشات و جذبات کو بنیاد بناتی ہے۔ لہذا اکثریت کے اصول کا ایک نقصان یہ ہوتا ہے کہ فیصلے غلط ہوتے ہیں اور دوسرا یہ کہ اقلیت، اکثریت کے جبر میں آجاتی ہے۔ اگر یہ جمہوریت ہے تو اس کو عوام کی حاکمیت نہیں اکثریت کی حاکمیت (Majority Rule) کہنا ہوگا۔ (۳۰)

اس پر مستزاد یہ کہ معیار یہ نہیں رہتا کہ ”کون (اور کیا)“ رائے دے رہا ہے بلکہ یہ ہوتا ہے کہ ”کتنے (اور جیسی بھی)“ رائے دے رہے ہیں۔ اس طرح سارے کا سارا معاملہ (Quality) یا معیار کی بجائے (Quantity) یا مقدار اور تعداد پہ چلا جاتا ہے۔

تاہم اکثریت کا اصول عقلی دلائل کے لحاظ (Logical Basis) یا اخلاقی بنیادوں (Moral Grounds) سے درست نہ بھی ہو تو کسی فیصلہ اور نتیجہ تک پہنچنے میں، یہی طریقہ کار اپنانا پڑتا ہے۔ خاص طور پر ایسے معاملے میں جہاں لوگوں کی مرضی ہی کو بنیاد بننا ہو! لیکن ایک معاملہ بہت اہم ہے۔ وہ یہ کہ لوگوں یا عوام الناس میں بہت سے لوگ ایسے ہوتے ہیں جو ریاستی و حکومتی فیصلوں یا معاملات میں مداخلت سے دلچسپی نہیں رکھتے، اس لئے کہ اس کا انہیں شعور نہیں ہوتا، بہت سوں کا ان فیصلوں سے سروکار نہیں ہوتا۔ کیونکہ کچھ لوگوں کی ترجیحات میں شامل نہیں ہوتا کہ وہ سیاست و حکومت کے کاموں سے وابستہ ہوں، بہت سے لوگ ایسے ہوتے ہیں جو شعور اور دلچسپی رکھنے کے باوجود مجبور ہوتے ہیں کہ انہیں ایسے معاملات میں صحیح طور پر شرکت کرنے کے مواقع اور وسائل میسر نہیں ہوتے۔

لہذا ایک تو اکثریت کے اصول کے نفاذ میں مشکلات پیش آتی ہیں اور دوسرا ایسی صورتحال میں جمع ہونے والی رائے کو حقیقی اکثریت کی رائے یا اکثریت کی حقیقی رائے کہنا بہت مشکل ہوتا ہے۔ گویا طریق کار خود، روح جمہوریت کو کچل کے رکھ دیتا ہے۔ (۳۱)

اس میں ظلم یہ ہوتا ہے کہ ایک ایسا فیصلہ یا رائے کو، جو ریاستی و حکومتی

معاملات سے زیادہ متعلق، موزوں اور مفید ہو سکتی ہے، ایک ان پڑھ کسان کی رائے کے برابر گنا جاتا ہے جو بعض اوقات اس کے شعور یا اس کی دلچسپی کے لحاظ سے اور بعض اوقات اس کے غیر متعلق اور غیر موزوں ہونے کے لحاظ سے بے فائدہ بلکہ نقصان دہ ہوتی ہے۔

اکثریت کے اصول کا یہ پہلو بھی تجزیہ طلب ہے کہ آیا جمہوری طریقے سے حاصل ہونے والی رائے، واقعتاً اکثریت کی رائے ہوتی ہے؟۔۔۔ اس کا جواب ہاں میں نہیں دیا جاسکتا۔

جمہوری نظام حکومت کو عمل میں لانے کے لیے انتخاب (Election) کا طریقہ کار اپنایا جاتا ہے۔ اس طریق کار کی پیچیدگیوں اور خامیوں سے قطع نظر۔۔۔ الیکشن میں رائے دینے کا حق دار صرف رجسٹرڈ ووٹر (Voter) ہو سکتا ہے۔ اس طرح آبادی کا ایک حصہ جو ”عوام“ میں شامل ہے، مگر جمہوری عمل سے باہر رہتا ہے۔ بطور ووٹر رجسٹرڈ ہونے کی شرط بلوغت (یا خاص حد عمر) ہے۔ جس کا مطلب ہے عوام الناس میں سے خاص عمر کے افراد اس عمل میں حصہ لیتے ہیں۔ پھر جب ووٹ ڈالے جاتے ہیں تو سارے رجسٹرڈ ووٹرز، ووٹ نہیں ڈالتے، بہت سارے لوگ الگ رہ جاتے ہیں اس سے اندازہ کیا جاسکتا ہے کہ آیا ”عوام“ کی اکثریت جمہوری عمل میں حصہ لیتی یا۔۔۔ اقلیت شامل ہوتی ہے اور اکثریت دور رہتی ہے؟

گویا اشتراکی مفکرین کا یہ اعتراض صحیح ثابت ہو جاتا ہے کہ:

Liberal political doctrines effectively restrict freedom to a minority of the population.(32)

مزید یہ کہ خود ڈالے گئے ووٹوں کی تعداد کا تجزیہ کیا جائے تو کچھ پہلو ایسے سامنے آتے ہیں کہ اکثریت کا خواب پورا نہیں ہوتا۔ مثال کے طور پر:

ا۔ اگر امیدوار دو ہوں اور ان کا فرق ۵۱ اور ۴۹ فیصد کا ہو تو کیا ۵۱ فیصد کو (یعنی صرف ایک کے فرق سے اور وہ بھی درج بالا تشنہ تکمیل طریق کار کے تحت اکثریت کہا جائے گا؟

ب۔ اگر امیدوار دو سے زیادہ ہوں (مثلاً چار) تو بہت دفعہ یہ ہوتا ہے کہ ۱۰۰ میں سے تیس ووٹ لینے والا ”اکثریت“ کا نمائندہ منتخب ہو جاتا ہے جبکہ اس کے خلاف (تین) مختلف امیدواروں کے حق میں ڈالے گئے (فرض کیا: ۲۶، ۲۴، ۲۰) ووٹ ”اقلیت“ قرار پاتے ہیں۔

اس تجزیے سے یہ بات واضح ہو کر سامنے آتی ہے کہ عوام کی حکومت کا تصور اور اکثریت کے اصول کا عمل میں آنا بہت حد تک ناممکن ہے۔ اس بنیاد پر یہ کہنا درست معلوم ہوتا ہے کہ:

اس کی وجہ یہ ہے کہ جمہوری نظام کے چپنے کے لیے کچھ خاص پس منظر اور ماحول درکار ہے جس کی عدم موجودگی میں جمہوری طرز حکومت، ثمر بار نہیں ہو سکتا۔ گویا جمہوریت کوئی ایسا آفاقی اصول اور عالمگیر صداقت نہیں جو ہر جگہ پر درست پایا جائے بلکہ ایک خاص طرح کے حالات اور خام مال کے ذریعے معرض وجود میں آتی ہے اور اسی خاص طرح کے ذرائع سے زندہ رہتی ہے۔

حقیقی جمہوریت کی سب سے پہلی ضرورت ایک ایسی ریاست ہے جو محدود آبادی کی حامل ہو۔ قدیم یونانی آبادیوں میں ایسی ریاستیں ہی جمہوریت کے لیے مثالی قرار پاتی تھیں۔ جہاں سارے شہری ایک وقت میں ایک جگہ جمع ہو کر اپنے اجتماعی معاملات کا فیصلہ، بحث و تمحیص کے بعد کر سکتے تھے۔ یہ الگ بات کہ شہری کی تعریف میں ایک محدود اقلیت ہی شامل ہوتی تھی بلکہ بچے، غلام اور نصف آبادی یعنی خواتین اس پورے عمل سے الگ رکھے جاتے تھے۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ حقیقی جمہوریت کے لئے یونانی ریاستوں کو مثالی قرار دینا تاریخی طور پر غلط ہوگا تاہم انہیں ابتدائی تجربہ گاہ کہا جاسکتا ہے مگر یہ حقیقت پیش نظر رہے کہ ایسی تجربہ گاہیں دنیا کے کئی علاقوں میں اس دور میں موجود تھیں۔

دور جدید کی بڑی ریاستیں جہاں ایک ایک شہر، یونان کی ریاستوں سے کہیں زیادہ آبادی رکھتا ہے، کیسے ممکن ہے کہ اصل جمہوریت راہ پاسکے۔ روسو (Rosseau) نے اسی بنیاد پر، جدید دور میں حقیقی جمہوریت کے وجود سے انکار کیا ہے اور اس کے لیے ایک چھوٹی ریاست کو ضروری قرار دیا ہے۔ (۳۳) دور جدید میں اس کا حل یہ نکالا گیا ہے کہ بڑی ریاستوں میں نمائندہ جمہوریت (Indirect Democracy) اپنانے کا تجربہ کیا گیا ہے۔ اس کی کئی صورتیں تخلیق کی گئی ہیں مگر جمہوریت کی روح کو سامنے رکھیں تو اس نظام میں کئی فکری و عملی الجھنیں جنم لیتی ہیں۔

سب سے پہلی بات تو یہ کہ کیا ایک فرد کی جمہوری خود مختاری (Individual Sovereignty) جو آزاد معاشروں میں براہ راست جمہوریت میں شریک ہونے والے شخص کو حاصل ہوتی ہے، قابل انتقال ہے یا نہیں؟ آیا کوئی دوسرا فرد اس کی نمائندگی ذہن و دل اور مافی الضمیر کے لحاظ سے کر سکتا ہے؟۔ قدرتی بات ہے کہ یہ ناممکن نظر آتا ہے جیسا کہ روسو (Rosseau) کہتا ہے:

Sovereignty can not be represented. (35)

اس کا مطلب یہ ہے کہ دور جدید کی نمائندہ جمہوریت، دراصل بنیادی جمہوری فکر اور فلسفے سے انحراف کے مترادف ہے۔ یہی وجہ ہے کہ سیاسی مفکرین اس نمائندہ جمہوریت کو اصل جمہوریت قرار دینے میں

ہچکچاتے ہیں اور بلکہ اسے جمہوری راہ سے گمراہی سمجھتے ہیں۔ مزید برآں یہ کہ اس کے نتیجے میں جو ادارے معرض وجود میں آتے ہیں وہ جمہوریت کی راہ میں ایک رکاوٹ بن جاتے ہیں۔

نمائندہ جمہوریت (Representative Democracy) قائم کرنے کا سب سے بڑا اور بنیادی، واحد ادارہ انتخابات ہیں۔ یہ خود حقیقی جمہوری حکومت کے قیام میں سب سے پہلی اور سب سے بڑی رکاوٹ ثابت ہوتے ہیں۔ (۳۶)

وہ یوں کہ موجودہ الیکشن کے نظام میں دولت مند طبقے کے علاوہ کوئی عام آدمی منتخب نہیں ہو سکتا۔ جبکہ یہ ایک بدیہی حقیقت ہے کہ معاشرے میں دولت مند افراد اقلیت میں ہوتے ہیں اور عوام الناس (غریب) اکثریت میں۔ ایسی صورتحال میں منتخب ہونے والے ممبران ایک ایسا ادارہ اور سیاسی طبقہ وجود میں لاتے ہیں جو عوام کا نہیں خواص کا نمائندہ ہوتا ہے اور اس طرح یہ نمائندے، اپنے مخصوص مفادات کے حصول کے لیے کوشاں ہو جاتے ہیں۔ ایسے معاشروں میں صرف سرمایہ داروں کو قوت و حاکمیت حاصل ہوتی ہے اور جمہوریت ان کی اس فوقیت کا ذریعہ بن جاتی ہے۔ اس طرح عوام الناس محروم طبقے میں تبدیل ہو کر رہ جاتے ہیں۔

لہذا مارکس (Marx) کا یہ تجزیہ درست ثابت ہوتا کہ جمہوریت دراصل بورژوا طبقے اور سرمایہ دارانہ معاشرے کی پیداوار جس نے جاگیر داری کی حاکمیت کو سیاسی اشرافیہ کی حکومت میں بدل دیا ہے۔ (۳۷)

پسماندہ ممالک میں ان پڑھ عوام کے لیے یہ طرز حکومت سیاسی لحاظ سے ناممکن العمل اور سماجی الجھنوں کا گورکھ دھند ابن کے رہ گیا ہے کیونکہ سیاسی نظام کے عملی اظہار کے لیے تعلیم و شعور بنیادی ضرورت ہے۔ پھر نمائندگی کرنے والوں اور نمائندوں کو منتخب کرنے والوں کے لیے چونکہ کوئی تعلیمی معیار مقرر نہیں ہوتا لہذا جمہوریت ایک جاہلوں کی حکومت بن کے رہ جاتی ہے۔ جہالت عام ہونے اور سیاسی مہارت نہ ہونے کی بنیاد پر ایسی حکومت اور عوام دونوں، پیشہ ورانہ مہارت اور منظم نوکر شاہی کے غلبہ میں آ جاتے ہیں۔

حکومت کا ایک اہم فریضہ اور کردار معاشرے میں ہم آہنگی اور یک جہتی پیدا کرنا ہوتا ہے جبکہ انتخابی جمہوریت میں پارٹی سٹم کی وجہ سے معاشرے میں مختلف طبقات میں منافرت اور ان کے مفادات کا باہمی ٹکراؤ شروع ہو جاتا ہے، نا اتفاقی اور طبقاتی سبقت کار۔ حجان بڑھنے لگتا ہے۔ افراد معاشرہ کے درمیان ایک غیر اعلان شدہ کشمکش شروع ہو جاتی ہے۔ اس بنیاد پر جمہوریت کی یہ شکل پورے تمدن کے لئے نقصان دہ

ثابت ہوتی ہے۔

یہی وجہ ہے کہ قدیم یونانی سیاسی مفکرین تھیوسی ڈائیڈرز (Thucydides) افلاطون (Plato) اور ارسطو (Aristotle)، جو بذات خود یونان میں اس طرح کے اثرات کا براہ راست مشاہدہ کر چکے تھے، اس طرز حکومت کی مخالفت کرتے تھے۔ (۳۸) وہ اسے 'ہجوم کی حاکمیت' قرار دیتے تھے اور یہ سمجھتے تھے کہ یہ دراصل حکومت کی ناکامی ہے کہ عوام الناس یا رعایا تنگ آکر خود حکومت سنبھال لیں اور ایک نئی طرح کی بدامنی یعنی انارکی (Anarchy) جنم لے۔ تاریخ کا مطالعہ بتاتا ہے کہ نہ صرف قدیم یونانی مفکرین سیاسیات بلکہ انیسویں صدی تک کے جدید سیاسی ماہرین 'عوام الناس کی حاکمیت' کے تصور کو قبول کرنے پر تیار نہ تھے۔

مائیکل سٹیورٹ (Michael Stewart) لکھا ہے کہ انیسویں صدی کے وسط تک جمہوریت ایک بدنام لفظ تھا، جو ہجوم کی حکومت کے لئے استعمال ہوتا تھا۔ گذشتہ ایک صدی میں اس طرز حکومت نے عام پسندیدگی کا مفہوم اور مقام حاصل کر لیا ہے۔ (۳۹)

اس پر طرہ یہ کہ جمہوریت کے اصلی مقاصد جن کا تعین، اس کو ترویج دیتے وقت ہوا تھا یا وہ توقعات جو اسے پھیلانے اور عام کرنے کا باعث بن رہی تھیں، ابھی ادھورا خواب ہیں۔ تاہم اس نے معاشروں میں انفرادی خواہشات کی حوصلہ افزائی کو ایک قانونی شکل دی ہے، جس سے افراد معاشرہ میں حرص و ہوس کی مسابقت نے جنم لیا ہے۔ اس صورتحال کو دیکھا جائے تو اشتراکی مفکرین کی یہ بات حقیقت معلوم ہوتی ہے کہ:

Democracy is like the 'market place', an institutional mechanism to weed out the weakest and establish those who are most competent in the competitive struggle for votes and power. (40)

اس تجزیے سے ایک اہم بات یہ ثابت ہوتی ہے کہ جن مقاصد اور آئیڈیلز کو سامنے رکھ کے جدید جمہوریت کو فروغ دیا گیا تھا، دراصل وہ ایسے میکیزم کا منطقی نتیجہ ہو ہی نہیں سکتے تھے۔ گویا یہ ان مقاصد کے حصول کا موزوں ذریعہ ہی ثابت نہیں ہوئی۔ ڈیما کریسی جو کچھ پیدا کر سکتی تھی وہ کر چکی اور جو کچھ اس کے ذریعے حاصل ہوا ہے وہ ان آئیڈیلز کے ساتھ میل نہیں کھاتا جو عوام کی حکومت کے دلکش نعرے میں مضمر تھے۔ لہذا انسانی معاشروں کی طرف سے وہ تائید جو جمہوریت کو (Popular) کرتے وقت کی گئی تھی، ایک فکری مغالطے سے کم نہ تھی۔ جمہوریت کی اس دلکشی اور پسندیدگی کی ایک بنیادی وجہ یہ ٹھہری ہے کہ اس نے ایک مخصوص طبقے کی حکومت میں عوام الناس کو بھی کسی حد تک شامل کر لیا ہے۔ گویا جمہوریت کے ہوتے ہوئے عوام الناس اس حقیقی مغالطے میں رضا کارانہ گرفتار رہتے ہیں کہ وہ بھی حکومت میں شامل ہیں۔

حوالہ جات و حواشی

- ۱۔ ابن منظور کہتے ہیں: جمہرت القوم: اذا جمعتمہم ---،
جمہرت الشئ، اذا جمعته۔ لسان العرب (بیروت۔ ۱۹۵۶ء): ۱۴۹/۳
اسی طرح فیروز آبادی لکھتے ہیں: و جمہرہ، جمعہ و القبر جمع علیہ التراب
و لم یطینہ۔ القاموس (مصر۔ ۱۹۵۲ء): ۳۹۳/۱
مرثی زبیدی کے بقول: و جمہر، أي الشئ: جمعہ۔
و الجمہور: معظم کل شیء۔ تاج العروس (بیروت۔ ۱۹۹۳ء): ۲۱۵/۱۰
- ۲۔ لسان العرب: ایضاً
- ۳۔ مثال کے طور پر، یہ لفظ اسی مفہوم میں، المادودی نے اپنی شہرہ آفاق کتاب الأحكام السلطانیہ میں، امامت (خلافت، اسلامی حکومت) کے انعقاد کی شرائط کے سلسلہ میں استعمال کیا ہے۔ وہ لکھتے ہیں:
فقال طائفة لا تعتقد الا بجمہور أهل العقد و الحل من کل بلد۔
احکام السلطانیہ (دارالعلوم، لاہور): ۶
- ۴۔ لوئیس معلوف، المنجد (بیروت۔ ۱۹۵۱ء): ۹۹، المعجم الوسیط (بیروت): ۱۳۷، عربی میں 'جمہوری' ایک شراب کا نام بھی ہے۔ یہ نام پڑ جانے کی وجہ جمہوری کے لغوی معنی ہیں۔ جیسا کہ ابن منظور فرماتے ہیں:
و قيل له الجمہوري لأن جمہور الناس يستعملونه أي أكثرهم۔ لسان العرب: ایضاً
بطروس البستانی نے لکھا ہے:
الجمهورية مؤنث الجمہوري، و الألفاظ الجمهورية هي المستعملة من
الجمہور۔ البستانی، محیط المحيط (بیروت۔ ۱۹۷۰ء): ۱۲۶
- اردو زبان میں جمہوریت کی اصطلاح اٹھارہویں صدی سے مستعمل ہے: اردو دائرہ معارف اسلامی (جامعہ پنجاب، لاہور۔ ۱۹۷۱ء): ۳۳۰/۷
- جیسا کہ دائرۃ المعارف میں ہے: جمہوریت: دیمقراطیہ، و هي ما تكون
بید اکثر الأهلالي۔ دائرۃ المعارف (مصر۔ ۱۹۶۵ء): ۵۳۳/۱۰
- اسی طرح ملاحظہ ہو: بطروس البستانی، محیط المحيط: ۱۲۶،
اسی اصطلاحی مفہوم کے ساتھ ڈاکٹر حسن صعب نے جمہوریت کی یہ تعریف کی ہے:
و اذا كان الحكم لأكثرية الشعب كان المنتظم جمہوریا أو دیمقراطیا۔

حسن صعب، علم السياسة (بيروت-۱۹۶۶ء): ۵۷،

اسی طرح لوئیس معلوف کے مطابق ایسی سوسائٹی یا ریاست جمہوریت کہلا سکتی ہے

جس کی حکومت کا انتخاب توارث کی بنیاد پر نہیں بلکہ عوام الناس کی اکثریت کی

مرضی پر ہو۔۔۔ وہ لکھتے ہیں: الأمة أو الدولة يعين زعيمها لوقت محدد لا بالتوارث بل بانتخاب جمهور

الأمة۔ المنجد، ایضاً

5- David Held, Models of Democracy (Cambridge-1987) .p:1,2

تقابل کے دیکھیے، الموسوعة العربية میں ہے:

ديمقراطية: كلمة مركبة أصلاً من كلمتين يونانيتين، ديموس، أي الشعب، كراتوس، أي الحكم۔

الموسوعة العربية الميسرة (قاهرہ۔۱۹۶۰ء): ۸۳۷

Also see: James Macgregor, Jack Walter, Government by the People (New

York-1953) p:33,34

۶۔ جیسا کہ ارنست بارکر (Ernest Barker) کی تھ گراہم (Keith Graham) کی

یاد دہانی ہمارے سامنے ہے:

Political thought begins with the Greeks. Barker, Greek Political Theory, P:30-32

Democracy, We must remember, was the name of a type of political regime first

durably established in the Greek City-State of Athens by the aristocrat

Kleisthenes in 508/707 Bc.

Keith, The Battle of Democracy, P:1

7- For the meaning of word { Demarchy } see:

Brian Martin, Democracy without Election, Social Anarchism (1995-96) Number: 21, pp:

18-5

۸۔ ولیم وان موئر کے (۱۳۱۵-۱۲۸۶ء) تیرھویں صدی کا نہایت اہم محقق اور مترجم ہے۔ یونان میں کورنٹھ کا یہ بپ، مشہور

عیسائی مفکر تھا جس کیوناس کے حلقہ ارادت میں تھا اور اسی کی فرمائش پر یونانی فلاسفہ، خصوصاً ارسطو کی کتب کے

ترجمے کیے۔

- De Wulf, M. (1912).
- William of Moerbeke. The Catholic Encyclopedia.
- 10- John Dunn, Democracy- The unfinished Journey (Oxford University Press-1989)
p:59
- 11- Aristotle, Politics, Loc. Cit., George H. Sabine, A History of Political Theory
(Japan-1981) p: 110
- 12- John Dunn, Op. Cit, Loc. Cit. Norberto Bobbio , Democracy and Dictatorship
(Translated by Peter Kennealy, Plity Press-1987) p:140
- 13,14- <http://dictionary.reference.com/browse/republic>, retrieved 20 August 2009,
Merriam-Webster's Dictionary of
Law, <http://dictionary.reference.com/browse/republic>, retrieved 20 August 2009
- 15- <http://www.constitution.org>, on 04-12-2009
- 16- <http://www.britanica.com>, & [.oll.libertyfund.org](http://www.libertyfund.org), retrieved on 04 December 2009
<http://www.merriam-webster.com/dictionary/republic> polity. (2009). Retrieved
December 5, 2009,
- Also see for Plato's views: Strauss, Leo, 'Plato' History of Political Philosophy 3rd
ed. University Of Chicago Press: Chicago, p. 34-68 1987.
- ۱۷- ابوالصغر فارابی، آراء اهل المدینۃ الفاضلہ (بیروت- ۱۹۵۹ء): ۱۱۰،
- 18- Erwin J. Rosenthal, Political Thought In Medieval Islam (Cambridge University
Press, 1958) p:136.
- Also see: Badger, English. Arabic Lexicon p:223
- 19- Macgregor and Walter, Ibid. Loc. Cit
- 20- Carl Becker, Modern Democracy (New York-1941) p:4
Robert Dahl, Democracy And Its Critics (Yale University-1989) p:2

We characteristically live, then, in an age of confused democracy. That 'democracy' obtains several meanings, is something we can live with. But if "democracy" can mean just anything, that is too much.

Giovanni Sartori, The Theory of Democracy Revisited (New Jersey-1987) p:6

- 21- Modern Forms of Government, p:199
- 22- H.J.Laski, An Introduction To Politics (London-1934) p:48
- 23- David Held, Models of Democracy, (Cambridge-1987). p:158
- 24- John Burheim, Is Democracy Possible? , p: 156
- 25- H.J.Laski, An Introduction To Politics (London-1934) p: 52
- 26- Dunn, Democracy, p:59
- 27, 28- Graem Duncan, Democratic Theory And Practice, (Cambridge University Press - 1983, 1st Edition) p:13

۲۸۔ اس صورتحال میں ہے وہڈ (Heywood) کا تجزیہ حقیقت کے قریب ہے:

So broad is respect for democracy that it has come to be taken for granted, its virtues are seldom questioned and its vices rarely exposed.

Andrew Hewood, Political Ideas & Concepts, (London-1998), p: 171

29. Graem Duncan, Democratic Theory And Practice, (Cambridge University Press - 1983, 1st Edition) p:13,
30. Jack Lively, Democracy, (Oxford-1975.) p: 9
31. David Held, Models of Democracy, (Cambridge-1987). p: 122
32. Noberto Bobio, The Future of Democracy, p:16
33. Noberto Bobio, Democracy And Dictatorship (Tr. Peter Kannealy) p:152
34. Even Rosseeu was convinced that a real democracy has never existed because it required, among other conditions, the existence of a small state, in which every citizen could easily get to know all the others.

- Sec: Bobio, The Future of Democracy. p: 130
35. Noberto Bobio, Democracy And Dictatorship (Tr. Peter Kannealy) p:152
36. David Held considers it a shameful and mistaken deviation from the original idea of government by the people, for the people and through the people.
- Sec: Models of Democracy, (Camberidge-1987).p: 130
- Jack Lively refers to Karl Marx saying that:Parliaments create inacceptabe barriers between the ruled and their representatives. Democracy, (Oxford-1975.) p: 62
37. John Burheim, Is Democracy Possible? , p: 152
38. Duncan writes: They found Athenian democracy, both in theory and in practice, to be vengeful, impolite in war and peace, unstable and mean spirited in its internal affairs.
- Democratic Theory And Practicc, p: 3
39. Michael Stewart, Modern Forms of Government (London-1959) p: 56
40. John Burheim, Is Democracy Possible? , p: 156